(۱۳)

ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم

حکمتِ اقبال

خودی اور نصب العین کا باہمی تعلق

© rasailojaraid.

اقبال نے خودی اور اس کے نصب العین کے باہمی تعلق کا ذکر اس طرح سے کیا ہے کہ گویا خودی نصب العین کی محبت ہے اور نصب العین کی محبت خودی ہے۔ نصب العین کو اقبال کبھی مدعا کبھی مقصد، کبھی مقصود، کبھی آرزو اور کبھی تمنا کا نام دیتا ہے۔ خودی کی بقا کا دارومدار نصب العین کی محبت پر ہے اس لیے کہ خودی کی زندگی خودی کی حرکت کا ہی دوسرا نام ہے۔ اگر وہ حرکت نہ کرے تو مردہ ہے دریا کی ایک لہر کی طرح کہ جب تک وہ چلتی رہے لہر ہے ٹھہر جائے تو کچھ بھی نہیں۔

ساحلِ افتادہ گفت بسے زیستم
ہیچ نہ معلوم شد آہ کہ من چیستم
موج از خود رفتۂ تیز خرامید و گفت
ہستم اگر بروم گر نروم نیستم

زندگی یا خودی فقط حرکت یا دوڑ یا ذوقِ پرواز یا ذوقِ سفر ہے۔

سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی
فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی

© rasailojaraid.

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

لیکن خودی کا سفر ہمیشہ اُس کے نصب العین کی سمت میں ہوتا ہے لیکن یہ سفر صحیح نصب العین کی سمت میں ہونا چاہیے جو خدا ہے۔ اسی لیے قرآن کا ارشاد ہے۔ فَفِرُّوْا اِلَى اللّٰهِ (یعنی جب کسی نصب العین کی طرف دوڑنا تمہاری فطرت ہے) تو خدا کی طرف دوڑو (جو سچّا نصب العین ہے) خودی کی حرکت یا دوڑ یا پرواز یا اس کا سفر نصب العین کی محبّت کے بغیر ممکن نہیں۔ نصب العین کی محبّت ہی خودی کو حرکت پر اکساتی ہے۔ اس کی حرکت کی سمت کو معین کرتی ہے اور اس کے کارواں کے لیے درا کا کام دیتی ہے۔

زندگانی را بقا از مدعاست
کارِ دانش را درا از مدعاست

یہ کہنا کہ زندگی یا خودی یا حیات ذوقِ سفر کے سوائے کچھ اور نہیں دوسرے لفظوں میں یہ کہنا ہے کہ زندگی یا خودی یا حیات فقط نصب العین کی محبّت ہے۔ اس کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں۔ خودی کے تمام افعال و اعمال اس کے نصب العین کے حصُول کے لیے سرزد ہوتے ہیں۔ خودی اپنے آپ کو کلیتہً نصب العین کے تابع کر دیتی ہے اور اُسی کو نیک و بد، خوب و زشت اور حق و باطل کا معیار بناتی ہے اور لہٰذا ہر فعل اور عمل کو اُسی کی وجہ سے قبول کرتی یا رد کرتی ہے۔ نصب العین ہمارے عمل کی جان ہے اور جان ہی کی طرح ہمارے عمل کے اندر پوشیدہ ہوتا ہے یہ ہمارا نصب العین ہی ہے جو ہمارے ہر عمل کا کیف و کم معیّن کرتا ہے۔

چوں حیات از مقصدے محرم شود — ضابطِ اسبابِ ایں عالم شود
خویشتن را تابعِ مقصد کند — بہرِ او چیند، گزیند، رد کند
ہمچو جاں مقصود پنہاں در عمل — کیف و کم از وے پذیرد ہر عمل

© rasailojaraid.
© rasailojaraid.

نصب العین ہی اعمالِ انسانی کی قوّتِ محرکہ ہے

نصب العین ہی وہ قوت ہے جو خودی کے عمل کے لیے مہمیز کا کام دیتی ہے۔ اس کی حرکت کو تیز کرتی ہے۔ اسی کی ایڑ سے خودی کے عمل کا گھوڑا بادِ صرصر کی طرح چلنے لگتا ہے۔ زندگی کی قوتیں سیماب کی طرح ہیں اگر ان کی کوئی سمت معیّن نہ ہو تو وہ کبھی ایک طرف اور کبھی دوسری طرف لڑھک جاتی ہیں۔ نصب العین ان قوتوں کے بہاؤ کی سمت متعین کرتا ہے۔ لہٰذا ان سب کو ایک مرکز پر لا کر مجتمع اور متحد اور منظّم کر دیتا ہے۔ نصب العین فرد کی زندگی کا ایک ایسا مرکز ہے جس کی طرف اُس کی تمام قوتیں سمٹ کر آ جاتی ہیں۔ نصب العین کی محبّت ہی خودی کے لیے ممکن بناتی ہے کہ اس دنیا کے تمام اسباب و ذرائع کو اپنے کام میں لائے کیونکہ نصب العین ہی ان کے استعمال کی ضرورت محسوس کراتا ہے اگر ہماری رگوں میں خون بڑی تیزی سے گردش کر رہا ہو یعنی اگر ہم اپنی پوری قوت سے سرگرمِ عمل ہوں تو سمجھ لینا چاہیے کہ کسی نصب العین کی شدّت محبت ہی ہمیں ایسا کرنے پر اُکسا رہی ہے۔ نصب العین کی محبّت کے بغیر ہم اپنی کسی اندرونی یا بیرونی قوّت کو استعمال نہیں کر سکتے کیونکہ اس کا کوئی مصرف ہماری سمجھ میں نہیں آ سکتا لہٰذا ہماری ہمت بیکار ہو کر رہ جاتی ہے نصب العین ایک ایسی قوّت ہے جس کے اثر سے ایک پوری قوم کے ہاتھ پاؤں متحرک ہو جاتے ہیں اور سینکڑوں دل نگاہیں بیک وقت اپنا زاویہ بدل لیتی ہیں گویا یہی وہ قوّت ہے جو ایک قوم کے تمام افراد کو آپس میں متحد و منظم کر کے ایک قوم بناتی ہے۔ نصب العین ہی خودی کی تمام ہنگامہ آرائیوں کا سبب ہے۔ وہی اس کے خاموش اور پُرسکون سمندر میں طلاطم پیدا کرتا ہے۔ اب اقبال کے الفاظ میں سُنیے۔

مدّعا گردد اگر مہمیزِ ما ہمچو صرصر می رود شبدیزِ ما

مدّعا رازِ بقائے زندگی جمعِ سیمابِ قوائے زندگی

گردشِ خونے کہ در رگہائے ماست تیز از سعیِ حصولِ مدعا ست

مدّعا مضرابِ سازِ ہمت است مرکزے کو جاذبِ ہر قوت است

دست و پائے قوم را جنباند او یک نظر صد چشم را گرداند او

آرزو ہنگامہ آرائے خودی موجِ بیتابے ز دریائے خودی

© rasailojaraid
© rasailojaraid
© rasailojaraid

ہمارے تمام چھوٹے چھوٹے مقاصد نصب العین کے ذیلی اور ضمنی مقاصد ہوتے ہیں جو اس کے ماتحت اس کی اعانت کے لیے پیدا ہوتے ہیں اور ہم ان کو نصب العین کی محبت اور کشش ہی کی وجہ سے اہمیت دیتے اور حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ نصب العین کی محبت ہمارے تمام اعمال کی قوت محرکہ ہے۔ وہی ان کو پیدا کر کے ان کی شیرازہ بندی کرتی ہے۔

آرزو صید مقاصد را کمند
دفتر اعمال را شیرازہ بند

نصب العین کی محبت ہی وہ پُراسرار انسانی خواہش ہے جو انسانی شخصیت کا گاڑی کے لیے کوچوان کی حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن شخصیت انسانی کی اس پُراسرار مرکزی اور حکمران خواہش کے متعلق صرف معلوم کر لینا کہ کسی نصب العین کی خواہش ہوتی ہے کافی نہیں جب تک یہ معلوم نہ کیا جائے کہ وہ کون سے نصب العین کی خواہش ہے۔ کیونکہ نصب العین سینکڑوں ہو سکتے ہیں اور ان میں سے بعض مختلف درجوں پر اچھے اور بلند بھی ہو سکتے ہیں اور بعض بُرے اور پست بھی۔ ان میں سے کون سا نصب العین ہے جو درحقیقت اس خواہش کا مقصود ہے اور لہٰذا صحیح اور سچا نصب العین ہے۔ چونکہ نصب العین حسن و کمال کا ایک تصوّر ہوتا ہے اور نصب العین کی خواہش حسن کی خواہش کا دوسرا نام ہے لہٰذا ایک بات بالکل واضح ہے کہ یہ خواہش ایک ایسے نصب العین کے لیے ہے جو منتہائے حسن و کمال ہو یعنی جس کے اندر وہ تمام صفاتِ حسن بدرجہ کمال موجود ہوں جن کا ہم تصوّر کر سکتے ہیں۔ جو اِن تمام نقائص سے کلیتہً پاک ہو جو ہمارے ذہن میں آ سکتے ہیں۔ حسن میں کمال کی خواہش اس لیے شامل ہے کہ جو چیز ناقص ہو وہ حسین نہیں ہو سکتی۔ نقص حسن کا نقیض ہے لہٰذا محبت کا دشمن ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بسا اوقات ہم ایک ناقص تصوّر سے بھی محبت کرتے ہیں لیکن یہ اسی وقت تک ممکن ہوتا ہے جب تک کہ اس کا نقص ہماری نظروں سے اوجھل رہے جوں ہی کہ ہم اس کے کسی نقص کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں ہمارے لیے ناممکن ہو جاتا ہے کہ ہم اس کی محبت کو پھر کسی درجہ میں بھی قائم رکھ سکیں۔ اقبال کہتا ہے کہ ہمارا نصب العین ایسا ہونا چاہیے جس کا حسن مکمل طور پر دلربا ہو، جس کے حسن کا احساس یا عشق یہاں تک ترقی کر سکے کہ اس کی شدت اور گہرائی کے اندر کوئی کمی یا

© rasailojaraid

کسر باقی نہ رہے، یہاں تک کہ انسان کی خودی اس کے عشق کی شراب سے مست اور مخمور ہو جائے اقبال کے نزدیک یہ نکتہ اس قدر اہم ہے کہ اسے جان لینا گویا زندگی کے راز سے واقف ہو جانا ہے اور اُسے نہ جاننا رازِ زندگی سے بیگانگی ہے۔

اے ز رازِ زندگی بیگانہ خیز　　از شرابِ مقصدے مستانہ خیز
مقصدے از آسمان بالا ترے　　دلربائے دلستانے دلبرے

کامل نصب العین کی صفات غیر محدود اور لازوال حُسن

انسان کے نصب العین کی ان عمومی اور مجمل صفات کی روشنی میں ہم اس کی مخصوص اور مفصل صفات بآسانی معلوم کر سکتے ہیں، مثلاً ہم یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ ضروری ہے کہ انسان کے نصب العین کا حسن غیر محدود اور لازوال ہو کیونکہ اگر ایک انسان یہ سمجھتا ہو کہ اس کے نصب العین کے حسن و کمال کی ایک حد ہے جس سے آگے وہ نہیں جا سکتا تو وہ سمجھے گا کہ اس کا ایک حصہ یا ایک پہلو حسن اور زیبائی کے اوصاف سے محروم ہے اور جہاں اس کا حسن ختم ہوتا ہے وہیں سے یہ محرومی شروع ہو جاتی ہے اور پھر اگر وہ یہ جانتا ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد اس کے نصب العین کا حسن ختم ہو جائے گا تو وہ یہ سمجھے گا کہ وہ اب بھی حسین نہیں کیونکہ اس کے حسن کو ختم کرنے والا کل کا دن آج بھی آنے والے دنوں میں شمار ہو رہا ہے۔

ازلی اور ابدی زندگی

پھر یہ بھی ضروری ہے کہ اس کا نصب العین زندہ ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی انسان جان بوجھ کر کسی ایسی چیز کے تصوّر کو اپنا نصب العین نہیں بنا سکتا جو اس کے نزدیک مردہ اور بے جان ہو وہ خود زندہ ہے لہٰذا کسی ایسی چیز کے لیے جو مردہ ہونے کی وجہ سے اس سے پست تر درجہ کی ہو وہ محبت کا جذبہ محسوس نہیں کر سکتا اور نہ ہی اس کی ستائش کر سکتا ہے اور نہ ہی اس کی خدمت کے لیے طرح طرح کی قربانیاں کرنے کے لیے تیار ہو سکتا ہے۔ پھر یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے حسن کی طرح اس کی زندگی غیر فانی ہو۔ کیونکہ اگر اسے یقین ہو جائے کہ اس کا نصب العین

© rasailojaraid.com

کل کو اپنی زندگی سے محروم ہونے والا ہے تو وہ یہ محسوس کرنے پر مجبور ہو گا کہ وہ آج بھی دائمی زندگی سے محروم ہے۔ یہی نہیں بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے نصب العین کے اندر زندگی کے وہ تمام اوصاف جن سے وہ آشنا ہے موجود ہوں مثلاً یہ کہ وہ سُنے، دیکھے، سمجھے، محسوس کرے اور اس کی محبت کا جواب محبت سے دے۔

محبّت اور عدمِ محبّت کے جذبات

انسانی دنیا میں اس کا کوئی مقصد یا مدعا ہو اور اسے اس بات کی قدرت حاصل ہو کہ وہ حصولِ مدعا کے لیے عمل کرے اور اپنے عمل کو کامیاب بنائے۔ دوسرے الفاظ میں اسے اس قابل ہونا چاہیے کہ بعض اعمال کو پسند کرے اور بعض کو ناپسند اور جن اعمال کو پسند کرتا ہو ان کی اعانت اور امداد کرے اور جن کو ناپسند کرتا ہو ان کی مخالفت کرے اور بالآخر روک دے۔ اپنے مددگاروں اور چاہنے والوں کی حوصلہ افزائی کر سکے اور مخالفوں اور دشمنوں کو سزا دے سکے۔ مختصر یہ کہ ضروری ہے کہ اس میں محبّت اور عدمِ محبّت کے تمام جذبات موجود ہوں اور وہ اپنے مدعا کی پیش برو کے لیے ان کا اظہار کرے۔ اگر کسی انسان کے نصب العین میں یہ اوصاف موجود نہ ہوں یا ان میں سے کوئی ایک صفت بھی موجود نہ ہو اور وہ اس بات سے آگاہ ہو جائے تو اس کے لیے اس نصب العین سے محبت کرنا اس کی ستائش کرنا یا اس کی خدمت یا اعانت کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔

محبّت کرنے والے سے عمل کا مطالبہ

محبّت ہمیشہ محبوب کی خاطر عمل کا تقاضا کرتی ہے اور اس عمل کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ محبوب کی خوشنودی حاصل کی جائے اور وہ رضامند اور مہربان ہو اور وہ چاہنے والے سے قریب آجائے۔ کوئی نصب العین رکھنے یا کسی نصب العین سے محبّت کرنے کا مطلب سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ عمل کے ذریعہ سے اس کی جستجو کی جائے اس کی خدمت اور اعانت کی جائے اور اس طرح سے اس کا قرب ڈھونڈا جائے لیکن اگر ایک نصب العین جس سے انسان محبّت کرتا ہے نہ کوئی عمل پسند کرتا ہے اور نہ ناپسند کرتا ہے نہ اس کے نزدیک کوئی بات اچھی ہے اور نہ بُری، دوسرے الفاظ

© rasailojaraid.com

ہیں۔ اگر وہ محسوس کرنے لگ جائے کہ اس کے نصب العین کے اندر ان میں سے بعض صفات موجود نہیں یا موجود تو ہیں لیکن بدرجہ کمال موجود نہیں تو وہ اس کو ایک ناقص تصور کرے گا اور اس سے محبت ترک کر دے گا۔

بے مثلی اور بے چگونی

پھر اس کے نصب العین کو اپنی صفات میں بے مثل اور بے نظیر ہونا چاہیے کیونکہ اگر اُسے معلوم ہو کہ دنیا میں کوئی اور تصور ایسا ہے جس کے اندر یہ صفات اسی درجہ کمال میں موجود ہیں تو وہ بیک وقت دو نصب العینوں سے محبت کرنے کے لیے مجبور ہوگا اور ایسا کرنا اس کی فطرت کے قوانین کی رو سے اس کے لیے ناممکن ہوگا۔ کوئی شخص بیک وقت دو نصب العینوں سے محبت نہیں کر سکتا اور حسن کی صفات بھی ایسی ہیں کہ وہ ایک سے زیادہ نصب العینوں میں موجود نہیں ہو سکتیں۔

خالقیّت

آخر کار یہ بھی ضروری ہے کہ پوری کائنات کی تخلیق اس کے نصب العین کے مدعا کے ماتحت اور اس کی خدمت اور اعانت کے لیے ہو۔ اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ اس کا نصب العین خود کائنات کا خالق اور حکمران نہ ہو اور ان تمام صفات کا مالک نہ ہو جو اُن دو صفتوں کے اندر مضمر ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو وہ قوانینِ قدرت جو کائنات کی مادّی، حیاتیاتی اور انسانی سطح پر کام کر رہے ہیں اس وجود کی تخلیق نہ ہوں گے جو اُس کا نصب العین ہے۔ لہٰذا اُس کے اور اس کے نصب العین کے مشترک مدعا کے ساتھ متصادم ہوں گے اور وہ اور اس کا نصب العین اس قابل نہ ہوں گے کہ اس مدعا کو حاصل کر سکیں۔ اور پھر اگر وہ جانتا ہو کہ کائنات جس میں اس کا اپنا وجود بھی شامل ہے خود بخود وجود میں آگئی ہے اور اس کے نصب العین کی حکمرانی کے دائرہ سے باہر ہے تو وہ محسوس کرے گا کہ اس کا نصب العین اس سے پست تر درجہ کا نہ زیادہ سے زیادہ اس سے مساوی درجہ کا کوئی وجود ہے لہٰذا اس سے محبت کرنے یا اس کی خدمت و اعانت کرنے یا اس کے لیے اپنی زندگی کو وقف کرنے کا کوئی جذبہ اپنے

© rasailojaraid.com

میں انسانی دنیا میں اس کا کوئی مدعا ایسا نہیں جس کے حصول کے لیے وہ متمنی ہو تو اس کا چاہنے والا کیونکر جان سکتا ہے کہ اس کی خدمت اور اعانت کے لیے اسے کیا کرنا چاہیے۔ انسان اپنے نصب العین کی اعانت کے لیے عمل کرنا چاہتا ہے اور جاننا چاہتا ہے کہ یہ عمل کیا ہو! وہ ایسی محبت سے مطمئن نہیں ہو سکتا جو اس سے کسی عمل کا مطالبہ نہ کرے اور جو خود عمل کی صورت اختیار نہ کر سکے۔ اگر وہ یہ جانتا ہو کہ اس کا نصب العین نہ سنتا ہے نہ دیکھتا ہے نہ جانتا ہے، نہ محسوس کرتا ہے نہ اس کی محبت کا جواب دے سکتا ہے نہ اس کی قدر دانی کر سکتا ہے تو وہ اپنے کسی عمل سے کوئی تسلی نہیں پا سکتا اور اس کے دل میں اپنے عمل کو جاری رکھنے کے لیے کوئی جذبہ پیدا نہیں ہو سکتا۔ جسے ہم نیکی کہتے ہیں وہ انگریزی کی مشہور مثل کے باوجود کبھی آپ اپنا انعام نہیں ہوتی بلکہ آخرکار یہ دلنواز یقین ہمیشہ اس کا انعام ہوتا ہے کہ وہ اس کے نصب العین کے نزدیک، جسے وہ ایک شخصیت سمجھتا ہے، پسندیدہ ہے۔

© rasailojaraid.c

قوّت اور قدرت

پھر یہ بھی ضروری ہے کہ ایک انسان کا نصب العین پوری طرح سے طاقتور اور قوی ہو کیونکہ اگر وہ سمجھے کہ اس کا نصب العین اتنی قوت نہیں رکھتا کہ اپنے مددگاروں کو جو اس کے مدعا کی پیش برو کے لیے کام کرتے ہیں، نوازے یا اپنے دشمنوں کو جو اس کے مدعا کے راستہ میں رکاوٹیں پیدا کرتے ہیں، سزا دے تو وہ محسوس کرنے لگے گا کہ ایسے نصب العین کی محبت یا اعانت ایک بے سود مشغلہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب بھی وہ دنیا کو اپنے نصب العین کے تقاضوں کے مطابق بدلنے کی پوری سعی کرے گا اس کے دشمن اس کی کوششوں کو ناکام بنا دیں گے اور جو کچھ اس نے بنایا ہے آسانی سے بگاڑ دیں گے۔ لہٰذا وہ سمجھے گا کہ اس کا نصب العین کمزور اور ناتواں ہے اور اس کی محبّت یا اعانت کا حقدار نہیں۔

نیکی

پھر ضروری ہے کہ اس کے نصب العین کے اندر نیکی کی تمام صفات بدرجۂ کمال موجود ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ صفات حسن کی صفات ہیں کیونکہ ہم انہیں چاہتے اور پسند کرتے

© rasailojaraid.c

ہیں۔ اگر وہ محسوس کرنے لگ جائے کہ اس کے نصب العین کے اندر ان میں سے بعض صفات موجود نہیں یا موجود تو ہیں لیکن بدرجۂ کمال موجود نہیں تو وہ اس کو ایک ناقص تصوّر کرے گا اور اس سے محبت ترک کر دے گا۔

بے مثلی اور بے چگونی

پھر اس کے نصب العین کو اپنی صفات میں بے مثل اور بے نظیر ہونا چاہیے کیونکہ اگر اُسے معلوم ہو کہ دنیا میں کوئی اور تصور ایسا ہے جس کے اندر یہ صفات اسی درجۂ کمال میں موجود ہیں تو وہ بیک وقت دو نصب العینوں سے محبت کرنے کے لیے مجبور ہو گا اور ایسا کرنا اس کی فطرت کے قوانین کی وجہ سے اس کے لیے ناممکن ہو گا۔ کوئی شخص بیک وقت دو نصب العینوں سے محبت نہیں کر سکتا اور حُسن کی صفات بھی ایسی ہیں کہ وہ ایک سے زیادہ نصب العینوں میں موجود نہیں ہو سکتیں۔

خالقیت

آخر کار یہ بھی ضروری ہے کہ پوری کائنات کی تخلیق اس کے نصب العین کے مدعا کے ماتحت اور اس کی خدمت اور اعانت کے لیے ہو۔ اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ اس کا نصب العین خود کائنات کا خالق اور حکمران نہ ہو اور ان تمام صفات کا مالک نہ ہو جو اُن دو صفتوں کے اندر مضمر ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو وہ قوانینِ قدرت جو کائنات کی مادّی، حیاتیاتی اور انسانی سطح پر کام کر رہے ہیں اس وجود کی تخلیق نہ ہوں گے جو اُس کا نصب العین ہے۔ لہٰذا اُس کے اور اس کے نصب العین کے مشترک مدّعا کے ساتھ متصادم ہوں گے اور وہ اور اس کا نصب العین اس قابل نہ ہوں گے کہ اس مدعا کو حاصل کر سکیں۔ اور پھر اگر وہ جانتا ہو کہ کائنات جس میں اس کا اپنا وجود بھی شامل ہے خود بخود وجود میں آگئی ہے اور اس کے نصب العین کی حکمرانی کے دائرہ سے باہر ہے تو وہ محسوس کرے گا کہ اس کا نصب العین اس سے پست تر درجہ کا زیادہ سے زیادہ اس سے مساوی درجہ کا کوئی وجود ہے لہٰذا اس سے محبت کرنے یا اس کی خدمت و اعانت کرنے یا اس کے لیے اپنی زندگی کو وقف کرنے کا کوئی جذبہ اپنے

© rasailojaraid.com

دل کے اندر محسوس نہیں کرے گا۔

یہ وہ صفات ہیں جو قرآن حکیم نے خدا کی صفات بتائی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ اقبال رُومی کی زبان میں ہمیں بتاتا ہے کہ انسان کی حقیقت اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ وہ خدا کو دیکھنے کی ایک آرزو ہے۔

آدمی دید است باقی پوست است
دید آں باشد کہ دیدِ دوست است

خُودی کی فطرت سے باہر قدم رکھنا ممکن نہیں

انسان کسی مذہب یا ملّت میں چلا جائے وہ اپنی فطرت سے بھاگ نہیں سکتا اور مجبور ہوتا ہے کہ ہر حالت میں اپنی فطرت کے تقاضوں کو پُورا کرے۔ اگر وہ خدا کی صفات کے حسن و کمال سے آشنا نہ ہو سکے اور لہٰذا خدا سے محبت نہ کر سکے تو اس کا جذبۂ محبّت کسی غلط نصب العین کے ذریعہ سے اپنے آپ کو مطمئن کرنے لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کا نصب العین خواہ کچھ ہو، وہ کوئی بے جان چیز مثلاً ایک پتھر یا درخت یا دریا یا پہاڑ ہو یا کوئی بُت یا قوم یا ملک یا نسل ہو یا کوئی زندہ حیوان مثلاً گائے یا بندر یا سانپ ہو یا کوئی ایسا تصور ہو جو کسی نظریہ یا ازم کا مرکز ہو۔ انسان ہر حالت میں خدا کی محولہ بالا صفات کو اپنے نصب العین کی طرف شعوری یا غیر شعوری طور پر منسوب کرتا ہے۔ مثلاً اگر اس کا نصب العین کسی ایسی چیز کا تصور ہو جو مردہ اور بے جان ہے تو پھر بھی وہ یہی سمجھتا ہے کہ وہ ایک زندہ شخصیت ہے جس کے اندر محبت اور نفرت اور قدرت اور قوت اور حسن اور نیکی اور صداقت کے اوصاف بدرجۂ کمال موجود ہیں۔ یہی سبب ہے کہ اس کے لیے ممکن ہوتا ہے کہ اپنے تمام اعمال کو اس کے تابع کرے اور دل ہی دل میں اس سے دعائیں مانگے اور برکتیں چاہے۔

مرا از خود بروں رفتن محال است — بہر رنگے کہ ہستم خود پرستم

اسرارِ حیات کی کلید

چونکہ انسان کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ وہ خدا کی آرزو یا محبّت ہے، اقبال

© rasailojaraid.c
© rasailojaraid.c

بجا طور پر سمجھتا ہے "زندگی کے سربستہ رموز کی کلید انسان کا اپنا دل ہے اور زندگی کے مقصد کو سمجھنے کے لیے اسے اپنے دل ہی کی آرزو کو سمجھنا چاہیے۔

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سُراغِ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن

اپنی اسی آرزو یا محبت کی وجہ سے انسان خدا کے ذکر سے دل جمعی اور اطمینانِ قلب حاصل کرتا ہے۔

دلِ ما آتش و تن موجِ دُو دش
تپیدن دم بدم سازِ وجودش
بذکرِ نیم شب جمعیت او
چو آں بے کہ بندد چوبِ عودش

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ

(وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں اور ان کے دل خدا کے ذکر سے اطمینان پاتے ہیں، خبردار دلوں کو اطمینان خدا کے ذکر سے ہی حاصل ہوتا ہے)

قرآن حکیم میں ہے کہ ہم نے انسان کو معزز بنایا ہے: وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ (اور بے شک ہم نے انسان کو معزز بنایا ہے) انسان کی اس عزت اور عظمت کا باعث یہی ہے کہ خدا نے اس کے دل میں اپنی محبت کا جذبہ پیدا کر دیا ہے۔

انسان کی سب سے بڑی ضرورت

انسان کی سب سے بڑی ضرورت خدا ہے اور اس کی باقی تمام ضرورتیں اس سب سے بڑی ضرورت کے ماتحت اس کی خدمت گزار ہیں۔ انسان کی اس ضرورت کا پورا کرنا، اس کو خدا کی معرفت بہم پہنچانا اور اس کو یہ بتانا کہ کون سا عمل خدا کی محبت کی نشوونما کرنے والا ہے اور کون سا اس کے منافی ہے، انسان کی سب سے بڑی خدمت ہے۔ انسان کی ساری تگ و دو کا مقصود انسان کی اس ضرورت کی تکمیل ہونا چاہیے۔ ہم انسانیت کے لیے اور جو کچھ بھی کریں وہ اس ضرورت کی

© rasailojaraid

تکمیل کی کوشش کے بالمقابل ہیچ ہے۔ کیونکہ انسان کی اسی ضرورت کا نام انسان یا آدم ہے۔

یہ ایک بات کہ آدم ہے صاحبِ مقصود
ہزار گونہ فروغ و ہزار گونہ فراغ

انسان کی انسانیت کا دار و مدار اس بات پر ہے کہ اسے خدا کی محبت کا جذبہ عطا کیا گیا ہے چونکہ انسان کی اصل خدا کی محبت کا جذبہ ہے۔ خدا کا منکر ہونے سے جو بڑی خرابی پیدا ہوتی ہے وہ یہی ہے کہ اس سے انسان کو اپنا منکر ہونا لازم آتا ہے۔ اگر انسان اپنے آپ پر ایمان لے آئے تو یہ کافی ہے کیونکہ پھر اس ایمان میں خدا پر ایمان لانا خود بخود شامل ہو جاتا ہے۔ انسان کو خود اپنی ذات کی تکمیل اور شخصیّت کی نشوونما کے لیے خدا کے تصور کی ضرورت ہے۔ جو شخص خدا کی عبادت اور اطاعت کرتا ہے وہ درحقیقت اپنی تکمیل کا خواہشمند ہے۔ لہٰذا یہ آخر کار خدا پرستی نہیں بلکہ خود پرستی ہے۔ ہم خودی سے [illegible] سکتے۔ ہماری خودی ہی سب کچھ ہے، اسی کو جاننا، پہچاننا اور اس کی تربیت اور تکمیل کرنا ہماری زندگی کا مقصد ہے لیکن اس کا کیا علاج کہ یہ مقصد خدا کی مخلصانہ عبادت اور اطاعت کے بغیر پُورا نہیں ہوسکتا۔

مرا از خود برون رفتن محال است
بہر رنگے کہ ہستم خود پرستم

خدا کی محبّت کے لیے اقبال کی اصطلاحات

انسان سراسر آرزوئے جمال ہے اور یہ آرزوئے جمال کمزور بھی نہیں بلکہ نہایت طاقتور ہے۔ انسان کیا ہے تمنّائے حسن کا ایک زبردست طوفان ہے جو موجزن ہے، اگر یہ طوفان تمنّا نہ رہے تو انسان بھی باقی نہیں رہتا۔

نہ ہو طغیانِ مشتاقی تو میں رہتا نہیں باقی
کہ میری زندگی کیا ہے یہی طغیانِ مشتاقی

اسی آرزوئے جمال یا خدا کی محبّت کو اقبال نے اپنے کلام میں کبھی آرزُو، کبھی تمنّا، کبھی دل، کبھی نظر، کبھی نگاہ، کبھی درد، کبھی داغ، کبھی سرور، کبھی سوز، کبھی بادہ، کبھی نشہ، کبھی مشتاقی، کبھی مستی،

© rasailojaraid.

کبھی شوق، کبھی خونِ دل، کبھی خونِ جگر، کبھی آہِ سحرگاہی، کبھی جان، کبھی غم، کبھی تب وتاب، کبھی جذبِ اندروں، کبھی جذبِ مسلمانی، کبھی جذبِ قلندرانہ، کبھی فقر، کبھی درویشی، کبھی ذوقِ تجلّی، کبھی عشق اور کبھی محبّت کے ناموں سے تعبیر کیا ہے۔ اور چونکہ یہ آرزوئے جمال یا خدا کی محبت مخالفانہ آرزوؤں سے آزاد ہونے کے بعد نہایت ہی زوردار عمل میں ظاہر ہوتی ہے جس کا لازمی نتیجہ تسخیرِ کائنات ہوتا ہے، لہٰذا اقبال اسے کبھی ذوقِ تسخیر کا نام بھی دیتا ہے۔

چیست جاں جذب و سرور و سوز و درد
ذوقِ تسخیرِ سپہرِ گرد گرد

خدا کی محبّت کے بغیر انسان مُردہ ہے

© rasailojaraid.

جب انسان کی اصل فقط خدا کی محبت ہے اور اس کے علاوہ انسان اور کچھ بھی نہیں یا زیادہ سے زیادہ ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ یا گوشت کا ایک ڈھیر ہے تو پھر یُوں کہنا چاہیے کہ جو شخص ہمہ تن خدا کی محبت نہیں وہ بحیثیت ایک انسان کے موجود ہی نہیں۔ کیونکہ جس حد تک ایک انسان اپنی زندگی کے تقاضوں کی تشفی اور تکمیل کرتا ہے اسی حد تک وہ زندہ اور موجود سمجھا جا سکتا ہے۔ زندگی یا خودی اس وقت آشکار ہوتی ہے جب خدا کی محبّت آشکار ہوتی ہے اور اپنی تکمیل اور تشفی کے مدارج سے گزرتی ہے۔ یہی خودی کی نمود یا زندگی کی نمود ہے۔ خدا کی محبت کی تربیّت خودی کی نمود ہے اور خودی کی نمود کا ہی دوسرا نام زندگی یا وجُود ہے۔ زندگی فقط خدا کی محبت کی آشکارائی ہے۔ اگر خدا کی محبت نہیں تو زندگی بھی نہیں۔

تری نگاہ میں ثابت نہیں خدا کا وجُود
مری نگاہ میں ثابت نہیں وجُود ترا
وجُود کیا ہے فقط جوہرِ خودی کی نمود
کر اپنی فکر کہ جوہر ہے بے نمود ترا

جو شخص اس بات کا قائل نہیں کہ اس کے اندر خدا کی محبت کا ایک طاقتور جذبہ موجود ہے اس کی تسکین اور تشفی اُسے خدا کا مقرب بنا سکتی ہے وہ شخص اپنے آپ کو ایک انسان کی حیثیت

© rasailojaraid.

سے نہالِ سدرہ کی مقدس شاخ یا دُوسرے لفظوں میں بالقوہ خُدا کا مقرب نہیں سمجھتا بلکہ چمن کائنات کا کوڑا کرکٹ سمجھتا ہے وہ خدا کا ہی منکر نہیں بلکہ اپنا بھی منکر ہے۔لیکن اگر انسان خدا سے الگ ہو کر خدا کا منکر بنتا ہے تو اپنے آپ سے الگ ہو کر اپنا منکر تو نہ بنے، اگر وہ اپنا منکر نہیں تو پھر اُسے خدا کے اقرار سے گریز کیسے ہو سکتا ہے۔ ؎

شاخِ نہالِ سدرۂ خار و خسِ چمن مشو
منکرِ اُو اگر شدی منکرِ خویشتن مشو

خدا کا انکار اپنا انکار ہے

خدا کے اقرار کا مقصد یہ ہے کہ خدا سے ایسی محبّت کی جائے جس سے انسان کی اپنی شخصیّت کی ترقی اور تکمیل ہو۔ جو شخص خدا کا اقرار کرتا ہے لیکن خدا سے محبّت نہیں کرتا وہ خدا کے اقرار سے اپنی شخصیّت کی تربیّت کا فائدہ حاصل نہیں کرتا۔ وہ خدا کا منکر تو نہیں لیکن اپنا منکر ہے۔ جب وہ خدا کے اقرار کے مقصود سے بے خبر ہے تو اس کا اقرار انکار سے بہتر نہیں بلکہ بدتر ہے کہ یہ خدا کو جاننے کے بعد خدا کی ناقدری ہے۔

منکرِ حق نزد مُلّا کافر است
منکرِ خود نزد من کافر است

خدا پر ایمان لانے اور خدا سے محبت کرنے کا فائدہ خود انسان کو ہے کہ اس کے بغیر انسان کا اپنا وجود متحقّق نہیں ہو سکتا۔ خودی کی زندگی یہ ہے کہ وہ بڑھے اور پھُولے اور تربّیت اور ترقی پا کر اپنے مخفی کمالات کو آشکار کرے۔ نشو و نما زندگی کا خاصہ ہے۔ زندگی اگر نشو و نما نہ پائے تو زندگی نہیں، بیج اگر نشو و نما پا رہا ہے تو زندہ ہے۔ اگر نشو و نما پانے سے رہ گیا ہے تو مُردہ ہے۔ اگر ایک جسم حیوانی نشو و نما پا رہا ہے تو زندہ ہے ورنہ مردہ ہے یا جاں بلب۔ نمود اور آشکارائی وجود یا زندگی سے الگ نہیں کیے جا سکتے۔

گفت موجود آنکہ مے خواہد نمود
آشکارائی تقاضائے وجُود

© rasailojaraid.com

خودی کی زندگی اور ترقی کے لیے خدا کی محبّت کی ضرورت

لیکن خودی کی تربیت اور ترقی اور نشوونما اور بالیدگی کا مقصد خدا کی محبت کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا کیونکہ خودی فقط خدا ہی کی سمت میں کامل نشوونما پاسکتی ہے۔ لہٰذا خدا کے منکر کو چاہیئے کہ اپنی زندگی کی فکر کرے یعنی خدا پر ایمان لائے اور خدا کی محبت کا حق ادا کرکے زندگی پائے۔

وجود کیا ہے فقط جوہرِ خودی کی نمود
کر اپنی فکر کہ جوہر ہے بے نمود ترا

جو شخص خدا کے بغیر جی رہا ہے وہ مردار ہے۔ اگرچہ لوگ اس کا ماتم نہیں کرتے۔

آنکہ بے حق زیست جز مردار نیست
گرچہ کس در ماتمِ او زار نیست

© rasailojaraid

خدا کی محبّت سے دِل کی کلی شگفتہ ہوتی ہے

جس طرح سے پھول کی کلی نسیمِ سحر کے بغیر کھل نہیں سکتی۔ انسان کے دل (یعنی خودی) کی کلی خدا کی محبّت کے بغیر کھل نہیں سکتی۔ جس طرح سے صبح کی ہوا کے زندگی بخشنے والے اثر سے پھول کی کلی شگفتہ ہو جاتی ہے اسی طرح سے خدا کی محبت کے زندگی اور راحت بخشنے والے اثر سے انسان کا دل مسرّت سے بھر جاتا ہے۔ مومن کے دل کی ساری داستان کا حاصل اور اس کی زندگی کی ساری تگ و دو کا باعث یہ ہے کہ جس طرح کلی نسیم سحر کے لیے تشنہ ہوتی ہے، مومن کا دِل خدا کی محبّت کے لیے تشنہ ہوتا ہے۔

کلی کو دیکھ کہ ہے تشنۂ نسیمِ سحر
اسی میں ہے مرے دل کا تمام افسانہ

انسان کا خدا سے بھاگنا اپنی تربیت اور تکمیل کو روک دینا ہے۔ حالانکہ خدا وہ ذات پاک ہے جو انسان کو پیدا کرتی ہے اور پھر اسے جسمانی نشوونما کے کمال پر پہنچاتی ہے۔ یہی ذاتِ پاک اس کی روحانی اور نفسیاتی نشوونما کی ضامن بھی ہے۔ خدا کی محبت سے ہی انسان کی خودی لالہ کے پھول کی

© rasailojaraid

طرح اپنے حسن کے کمال کو پہنچتی ہے لہٰذا خدا سے حجاب کی وجہ کیا ہے۔ اگر لالہ کی کلی جو کھل کر پھول بن جاتی ہے اور ایک دلہن کی طرح رنگین لباس میں ملبوس ہو جاتی ہے، نسیم سحر سے دلہنوں ہی کی طرح حجاب کرے تو وہ اپنے حسن کے کمال کو کیسے پہنچ سکتی ہے۔

عروسِ لالہ مناسب نہیں ہے مجھ سے حجاب
کہ میں نسیمِ سحر کے سوا کچھ اور نہیں

خدا کی محبّت خودی کے ارتقاء کی شرط ہے

انسان کا خدا سے گریز کرنا اپنے آپ سے گریز کرنا ہے کیونکہ خدا کی محبت کے بغیر انسان اپنے آپ کو نہیں پا سکتا اور اگر انسان خدا سے بھاگے گا تو زود یا بدیر پھر اس کو خدا ہی کی طرف واپس لوٹنا پڑے گا۔

© rasailojaraid.

از کہ بگریزیم از خود ایں محال
از کہ رو تابیم از خود ایں خیال

مومن اسی حقیقت کا اعتراف کرتا ہے جب وہ کہتا ہے لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ وَلَا مَنْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّا اِلَیْهِ (کفر اور ہر بُری چیز سے بچنا اور ایمان اور ہر اچھی چیز پر قدرت پانا خدا کی توفیق کے بغیر ممکن نہیں اور خدا سے بھاگنے کے بعد اگر کوئی راستہ نجات کا ہے تو خدا ہی کی طرف ہے) جس طرح سے خدا نے انسان کی جسمانی نشوونما اپنے ذمّہ لے رکھی ہے اسی طرح سے اس نے انسان کی روحانی یا نفسیاتی نشوونما بھی اپنے ذمّہ لے رکھی ہے۔ لیکن چونکہ انسان اپنے فکر و عمل میں آزاد ہے وہ اپنی نشوونما کی روحانی یا نفسیاتی سطح پر اپنے اختیارات کو غلط طور پر کام میں لاتا ہے اور اس طرح سے خدا کے مقاصد میں حائل ہوتا ہے۔ اے انسان! کون سی چیز ہے جو تمہیں ایسے رحیم و کریم خدا سے جو تمہارا رب ہے بغاوت پر مجبور کرتی ہے (یٰاَیُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِیْمِ) انسان کا روحانی یا نفسیاتی ارتقاء جو در اصل اس کی خودی کا ارتقاء ہے۔ اُس وقت تک ممکن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنے اختیارات کو بتمام و کمال خدا کے تابع نہ کر دے اور اپنے آپ کو کلیتہً خدا کے سپرد نہ کر دے۔ اقبال اس خیال کو یوں ظاہر کرتا ہے:۔

© rasailojaraid.

خویش را در بازو خود را باز گیر
دام گستر از نیاز و ناز گیر

(اپنے آپ کو ہار دے اور اس کے نتیجہ کے طور پر اپنی خودی کو پالے۔ اطاعت اور فرمانبرداری کا دام پھیلا اور خودداری کو اپنی گرفت میں لا!)

یک بینی اور یک اندیشی کے بغیر خودی اپنے آپ کو نہیں پاسکتی

چونکہ خدا کی محبت خودی کی مرکزی خواہش ہے اور باقی خواہشات اس کے تابع ہیں پس جو خواہش اس خواہش کی حریف ہوتی ہے وہ خودی کی اپنی خواہش نہیں ہوتی بلکہ خودی کی خواہش کے راستہ میں ایک ناگوار بلکہ خطرناک رکاوٹ ہوتی ہے۔ لہٰذا ہر ایسی خواہش کو مٹانا خودی کے لیے ضروری ہوتا ہے تاکہ خودی اپنے آپ کو پاسکے اور اپنی فطرت کے مخفی کمالات کو آشکار کرسکے۔ دوسرے الفاظ میں ماسوی اللہ سے کٹ کر خدا سے وابستہ ہونا خودی کی فطرت ہے۔ جب تک کہ خودی غیر اللہ کے ساتھ وابستہ رہے وہ اپنے آپ کی طرف آنے کے لیے یعنی اپنی فطری محبت کی تشفی اور تکمیل کے لیے آزاد نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس جب وہ غیر اللہ سے کٹ جائے تو اپنے آپ کی طرف لوٹنے کے لیے آزاد ہو جاتی ہے اور غیر اللہ کو اپنے نصب العین کے تابع کر دیتی ہے۔ جب تک انسان خدا کی محبت میں پختہ نہ ہو یا ماسوی اللہ سے پوری طرح نہیں کٹ سکتا۔

تا نہ رمزِ لا الہ آری بدست
بندِ غیر اللہ را نتواں شکست

اگر ہم غیر اللہ کی محبت سے کنارہ کش ہو کر خودی کے جذبۂ محبت کو آزادی کے ساتھ اپنا اظہار کرنے دیں تو خدا ملتا ہے اور اگر ہم آزادی کے ساتھ خدا کی جستجو کریں تو ہماری خودی اپنے کمال کو پہنچتی ہے۔ گویا ہمیں اپنی خودی سے خدا ملتا ہے اور خدا سے اپنی خودی ملتی ہے اور دونوں انعامات کی حقیقت ایک ہی ہے۔

از ہمہ کس کنارہ گیر صحبتِ آشنا طلب
ہم ز خدا خودی طلب ہم ز خودی خدا طلب

© rasailojaraid.c
© rasailojaraid.c